تصوّر مہدیؑ

شہید العصر مفکّر اسلام آیۃ اللہ العظمیٰ آقائی محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

موسسۂ نور ہدایت حسینیۂ غفران مآبؒ لکھنؤ ۳

RS/25

025 //1

(2)

شہید العصر مفکر اسلام

آقائی محمد باقر الصدر

تصور مہدی

فہرست

نام باب	صفحہ نمبر
مہدئیؑ کیلئے اس قدر طویل عمر کیسے ممکن ہے	۱۱
معجزہ اور لمبی عمر	۱۹
یہ سلسلہ اہتمام اس ایک ذات کی خاطر کیوں؟	۲۵
تکمیل قیادت	۳۳
کیسے ایمان لے آئیں مہدئیؑ موجود ہے	۴۳
قائد ظاہر کیوں نہیں ہوتا	۵۱
اس قدر وسیع و عالمگیر کام اور تنہا مہدئیؑ	۵۹
یوم موعود اور عمل تغیر کا طریقہ کار	۶۳

عرض ناشر

خداوند عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے قائد ملت جعفریہ آفتاب شریعت مولانا سید کلب جواد نقوی صاحب امام جمعہ لکھنو کی سر پرستی میں چلنے والے ادارہ کو اتنی قوت عطا فرمائی کہ اب وہ مدرسۂ نور ہدایت کے قیام کے بعد مکتبۂ عماد الاسلام کے قیام تک پہونچ گیا اور ساتھ ہی ساتھ مفید کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن یہ سلسلہ اس اعتبار سے اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ اس نظام کی ابتدا ولی امر مسلمین رہبر انقلاب اسلامی آیۃ اللہ العظمٰی السید علی خامنہ ای مدظلہٗ العالی کی اشاعت تصنیف سے ہوئی ہے۔

اب یہ موسسہ کی دوسری خدمت ہے کہ فیلسوف اسلام مفکر عظیم آیۃ اللہ العظمٰی علامۃ الشہید السید محمد باقر الصدرؒ کی بیش بہا تحریری کاوش کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

آقائے شہیدؒ کی یہ کتاب یعنی ''تصور مہدیؑ'' پہلی بار ترجمہ کی صورت میں دفتر تبلیغات اسلامی اسلام آباد سے اور دوسری بار ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ میں ''مؤسسۂ الامام المہدیؑ'' سے شائع کی گئی تھی۔ اب اس کتاب کی افادیت کے مدنظر تیسری بار مؤسسۂ نور ہدایت شائع کر رہا ہے۔ اس تصنیف میں ان تمام سوالوں کے جوابات موجود ہیں جو اکثر مخالفین یا تجدد پسند افراد کی طرف سے حضرت ولی عصر حجۃ اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہٗ الشریف کے وجود، غیبت اور طول عمر پر اٹھائے جاتے ہیں۔

قوی امید ہے کہ مومنین اس کتاب کو پڑھ کر اپنے قلوب کو اور منور فرمائیں گے ساتھ ہی دوسرے اشخاص کو بھی مطمئن کر کے حق تک پہونچائیں گے۔

انشاء اللہ بتائید حضرت حجۃ العصر علیہ الصلوٰۃ والسلام مؤسسہ کا یہ تحریری واشاعتی سلسلہ مستقلاً جاری رہیگا۔

خادم مؤسسہ

سید مصطفےٰ حسین نقوی اسیف جائسی

۳ر شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ مطابق ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۳ء بروز سہ شنبہ

مہدویت کوئی نوایجاد تصور نہیں۔ اس کی ابتداء وجود کائنات کے ساتھ ساتھ عمل پذیر ہوئی۔ اس نظریہ کا تعلق اسلامی عقیدہ سے مخصوص نہیں بلکہ یہ ایسی خواہشات کا مظہر ہے، جس کی طرف بنی نوع انسان اپنے مختلف ادیان و مذاہب کی پیروی کرتے ہوئے متوجہ ہوئی۔ اس تصور و نظریہ کے تحت انسانی فلاح و بہبود کے لئے خطۂ ارض پر ایک دن معین ہے جس روز ان آسمانی ادیان کے عظیم مفاہیم کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ وہ اپنے آخری اور حقیقی ہدف کو پائیں گے۔ اندھیروں میں محصور کائنات اور صدیوں سے مصائب و آلام کی آگ میں جھلستی انسانیت راحت و اطمینان کی منزل کو پہنچے گی۔ وہ دن سکون و اطمینان کا دن ہوگا۔

بے شک اہلِ ایمان جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اس غیبی دن کے داعی اور منتظر ہیں مگر اس کا اختصاص صرف اہلِ ایمان کے ساتھ نہیں بلکہ یہ نظریہ دیگر اذہان میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ اور اس کا عکس سخت ترین نظریات و عقائد رکھنے والوں پر بھی پڑا جو غیب کے منکر ہیں۔ جدت پسند اور مادیت پرست حضرات جنہوں نے تاریخ کی تفسیر متناقضات سے کی ہے وہ بھی "یومِ موعود" کے متعلق سوچنے پر مجبور نظر آتے

ہیں جس روز یہ تمام تناقضات ختم ہو جائیں گے۔ عدل و انصاف کا بول بالا اور اتحاد و سلامتی عام ہو جائے گی۔

تصوّر یا عقیدۂ یوم موعود دنیا میں عدل و انصاف کی پرچم کشائی کا نام ہے۔ اس عقیدے کے مطابق عدل کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک دن ظلم و ستم کے خلاف سینہ سپر ہو اور اس کو جڑ سے اکھاڑنے کے بعد اس کائنات کو نئی بنیادوں پر استوار کرے ظلم ایک غیر فطری اور غیر طبعی کیفیت کا نام ہے۔ اس کا غلبہ دنیا کو جس قدر سیاہیوں میں محصور کر دے۔ سیاہ آندھی کی طرح تمام موجوداتِ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لے لیکن اپنی غیر فطری اور غیر طبعی خصوصیت کی بناء پر اس کا انجام شکست ہے یوم موعود۔ ظلم کی تمام تر آب و تاب اور عروج کی حتمی اور لازمی شکست ہے۔ لہذا "نظریہ مہدویت" مظلوم انسانوں کے لئے امید کی روشن کرن ہے۔ ظلم و استحصال میں جکڑے انسانوں کو یقین دلاتا ہے کہ ایک ایسا دن طلوع ہونے والا ہے جب عدل و انصاف کے اصولوں پر کائنات کی تعمیر نو ہو گی۔

تصور مہدیت ظہور اسلام سے قبل بھی دنیا میں عمل پذیر تھا اس کی قدامت اور آفاقیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اسلام نے اسے اپنے مخصوص انداز اور نکتۂ نظر سے بیان کیا تاریخ ادیان کے ورق اوّل سے یہ نظریہ مظلوم لوگوں کی امیدوں کا مرکز ہے۔ اسلام نے اسے مزید مضبوط و مستحکم کیا (کیونکہ اسلام میں بھی مہدیت کا اپنا تصور موجود ہے تاکہ مظلوموں کے اذہان میں مایوسیوں سے نجات کی امید مزید پختہ ہو جائے۔ اسلام ہی نے غیبی نظریہ کو مہدیؑ کے حوالے سے عملی وجود بخشا اور اسے مستقبل سے سمیٹ کر زمانۂ حاضر میں لے آیا۔ دنیا اس کی منتظر تھی جو مستقبل بعید میں اس کو تحفظ فراہم کرنے والا تھا۔ اسلام نے دنیا کو ذات مجہول کے بجائے ایک فعلی نجات دہندہ کی طرف متوجہ کیا۔ جو عملاً خود بھی منتظر ہے اور دنیا کے ساتھ یوم موعود کا انتظار کر رہا ہے۔ کہ جب وہ اپنی آمد کے عملی حالات کی تکمیل پر اپنا عظیم

کردار ادا سکے گا۔

پس مہدیت کسی فرد کی ولادت کا انتظار یا کسی خبر کی سچائی کا انتظار نہیں ایک واقعی اور خارجی عمل ہے جس کے اثرات کے ہم منتظر ہیں وہ ایک انسان معین ہے جو مکمل انسانی شخصیت کے ساتھ زندہ ہے۔ ہمیں دیکھتا ہے۔ ہمارے دکھ سکھ اور رنج و محن میں شریک ہے۔ وہ زمین پر کمزوروں اور مظلوموں پر ہونے والی زیادتیوں کو دیکھتا ہے اور بے چینی و بے قراری کے ساتھ اس وقت کا منتظر ہے جب اس کا ہاتھ ان کی دادرسی کو بڑھے گا۔ اور ظالموں کا نشان تک مٹا دے گا۔ اس قائدِ عدل و انصاف کیلئے یہ طے کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی موجودگی کا اعلان اور زندگی کا انکشاف نہ کرے حالانکہ وہ ان کے درمیان موجود اور زندہ ہے اور اپنے ہمعصروں کیساتھ "یوم موعود" کا بشدت سے منتظر ہے ظاہر ہے مہدیت کی یہ عملی وضاحت و توجیح اس غیبی حقیقت کو عملی دنیا سے قریب تر کرتی ہے اور مظلوموں کے درمیان اسے موجود کر دیتی ہے چاہے ان کے نفسیاتی شعور میں انتظار کی گھڑیاں کس قدر بھی طویل کیوں نہ ہوں یہ اسلامی وضاحت و تفصیل ان مظلوم انسانوں اور اس نجات دہندہ کے درمیان ایک مختصر پل کا کام دیتی ہے۔

مہدویت کے بارے میں اسلامی نظریہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس پر اس طرح ایمان لائیں کہ اسے (مہدی) ایک معین زندہ انسان تسلیم کریں جو آپ ہمارے ساتھ ہم سب کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے اور مشیتِ ایزدی کیطرف سے ایک معین وقت کا منتظر ہے جس کا انتظار ہم بھی کر رہے ہیں۔ لہذا یہ تصورات ہمارے نفوس پر روحی کا درجہ رکھتے ہیں جو انسانوں کو ظلم و ستم کی پرواہ نہ کرنے کا حوصلہ بخشتے ہیں کیونکہ یہ ظلم و ستم آخر کار مہدیؑ کے ہاتھوں نیست و نابود ہونے ہیں اس طرح ظلم و ستم کے اختتام کا انحصار اس منتظر قائد پر ہے۔ جو کسی ظالم کی بیعت نہیں کرے گا۔ اور جو عنقریب ظاہر ہونے والا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے عہد کے ظالمانہ نظام کی آبیاری نہ کریں اور عادلانہ نظام کے قیام کے لئے جدو جہد کریں۔

احادیثِ نبویؐ میں انتظار کی بہت اہمیت و فضیلت بیان کی گئی ہے اور مسلمانوں کو مہدیؑ کے مسلسل انتظار کی متعدد بار تاکید کی گئی ہے۔ اس طرح مومنین اور ان کے قائد کے درمیان روحانی رشتے و تعلق اور وجدانی ربط کو ثابت کرنا ہے مگر یہ ربط و تعلق صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مہدیؑ زمانہ حال میں انسانی شخصیت میں موجود ہو، لہٰذا یہ نظریہ مہدی کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔

مزید برآں ہر وہ انسان جو ظلم و ستم کی پرواہ نہیں کرتا اس نظریئے سے حوصلہ پاتا ہے اور جو رنج و الم اسے ظالموں سے پہنچتے ہیں ان کے اثرات میں تخفیف ہوتی ہے کیونکہ وہ اس عقیدے کا قائل ہونے کی وجہ سے جانتا ہے کہ وہ ہرگز تنہا نہیں بلکہ اس کا امام و قائد اس کے رنج و الم میں شریک ہے وہ قائد بھی عملی طور پر ان جور و ستم کا احساس رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کا ہم عصر اور اس کے انسانی شخصیت میں موجود ہے یعنی مستقبل میں پیدا ہونے والی یا آنے والی کوئی شخصیت نہیں بلکہ عملی طور پر موجود و قائم ہے۔

ایک مادی وجود پر عقیدہ رکھنے سے کچھ منفی پہلو بھی نکلتے ہیں اور بہت سے افراد کو نظریہ مہدیت اختیار کرنے میں ذہنی الجھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ اس نظریئے کے مطابق مہدیؑ ایسا معین انسان ہے جو گزشتہ دس صدیوں سے بھی زیادہ عرصے سے موجود ہے۔ اور ایک وقت معین پر ظہور تک برابر موجود رہے گا مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک انسان اتنی طویل زندگی بسر کرے اور ان طبیعی اور فطری قوانین و عوامل سے مامون ہو جن سے ہر انسان کو گزرنا پڑتا ہے یعنی پیدائش، جوانی، بڑھاپا اور آخر فطری طور پر ایک مدت کے بعد مر جانا۔ کیا یہ بات فطری اور مادی اعتبار سے ناممکن و محال نہیں؟ دوسرا سوال وہ یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سب اہتمام اس خاص انسان کے لئے کیوں؟ جس کی خاطر اسے تمام فطری و طبیعی قوانین معطل کرنا پڑے۔ اور یوم موعود تک اس کی زندگی کی حفاظت کرنے کا دشوار

کام ذمہ لینا پڑا۔ کیا انسانیت بانجھ ہو گئی ہے کہ تمھر قائدین پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ مسلسل وقت اس قائد کے لئے کیوں مختص کیا گیا جبکہ وہ قائد عام طبیعی و فطری قوانین کے ساتھ یومِ موعود کو بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ عام لوگوں کی طرح پرورش پاتا اور بتدریج اپنے مشن پر عمل کرتا یہاں تک کہ ظلم و ستم کا خاتمہ اور عدل و انصاف کا آغاز کرتا۔

ان کے محلِ نظر تیسرا سوال مہدیؑ کی ولادت سے متعلق ہے کہ اگر مہدیؑ اس معین شخصیت کا نام ہے جو آئمہ اہل بیتؑ میں سے گیارہویں امام کا فرزندِ ارجمند ہے اور ۲۵۶ھ میں پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے والد ماجد کے بوقتِ وفات پانچ سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہو سکتا۔ یہ عرصہ عمر کا ایسا حصہ ہے جس میں فکر و شعور اور عقل و دانش کی کمی کی بنا پر دینی یا دنیاوی علوم میں دسترس حاصل کرنا محال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کیونکر ممکن ہے اس (مہدیؑ) نے اتنی کم عمری میں اپنے والد سے مکمل تعلیمات و ہدایات حاصل کر لی ہوں گی پس کیسے اس شخص میں اس قدر اہم کام کو سرانجام دینے کیلئے کافی و شافی صلاحیت و قابلیت ہو سکتی ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس میں اس قدر طاقت و استعداد ہے اور وہ اس کام کے لئے ہر لحاظ سے تیار ہے تو پھر یہ انتظار کس لئے؟ اور کیا یہ صدیوں کا انتظار بے معنی نہیں؟ کیا معاشرے نے جو ظلم و ستم سہے ہیں یا جن مصائب و آلام سے گزر رہا ہے۔ یہ اس بات کا جواز نہیں کہ قائد ظہور پذیر ہو اور جبر و استحصال کی تاریکیوں میں شمعِ عدالت فروزاں کرے۔

اب ایمان کا سوال ہے کہ کس طرح مہدیؑ پر ایمان لائیں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سابقہ تمام باتیں ممکن ہیں تو کیا انسان ایک فرضی بات پر بغیر کسی شرعی اور عقلی دلیل کے ایمان لے آئے اور پھر اس کا معتقد ہو جائے؟ کیا عقیدہ کے لئے وہ چند روایات و احادیث جو رسولِ مقبولؐ سے نقل کی جاتی ہیں کافی ہیں کہ جن کی صحت و درستی کا بھی یقین نہیں؟

کیا یوم موعود کا عظیم کام فردِ واحد سے انجام پذیر ہونا ممکن ہے کیونکہ یہ کام تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے مترادف ہے جبکہ تاریخ بڑی بڑی تحاریک و شخصیات کے صدیوں پر محیط مسلسل عمل کا نام ہے۔ اور ان بڑی بڑی شخصیات نے اپنے دور کے مسائل کا نہ صرف تجزیاتی و کلی ادراک کیا بلکہ ذاتی فہم و فراست سے ان مسائل کو حل بھی کیا اور پھر کہیں جاکر تاریخ انسانیت میں جگہ پائی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک فرد جس کی صلاحیت و قابلیت ابھی تجربات سے گذری نہیں ہم اس سے امید رکھیں کہ وہ ظاہر ہوگا اور تن تنہا تمام مسائل کو حل کر دے گا۔ اور ایک تاریخی انقلاب برپا کرے گا۔

یہ تھے وہ سوالات جو اذہان میں مختلف انداز سے جنم لیتے ہیں۔

ان کے اسباب فقط فکری و نظریاتی نہیں بلکہ کسی قدر نفسیاتی اور فطری بھی ہیں۔

پوری دنیا پر طاری احساس خوف و مصیبت دنیا پر روز بروز بڑھتے ہوئے جور و ستم بے دینی کا تند و تیز رفتار سیلاب ہر شخص کی حالات میں تبدیلی کی ناکام خواہش جیسے محرکات شکوک و شبہات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح انسان میں نظریاتی شکست و ریخت اور کمزوری اور گمراہی کا احساس ابھرتا ہے۔ نوبت بایں رسید کہ وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ پورے عالمی نظام میں تبدیلی ایک عظیم جنگ و جدل اور قتل و غارت کا پیش خیمہ ہے۔

اب ہم سابقہ سوالات کو بالترتیب موضوع گفتگو بناتے ہیں اور ہر سوال کا جواب وسعت اوراق کو مدنظر رکھتے ہوئے دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مہدی کیلئے اس قدر طویل عمر کیسے ممکن ہے

دوسرے لفظوں میں کیا اس بات کا امکان موجود ہے کہ کوئی انسان اس فاسد کائناتی نظام کو بدلنے کے لئے صدیوں زندہ رہے (جیساکہ اس قائد کے لئے اسلامی نکتہ نگاہ سے فرض کیا گیا ہے جس کی عمر شریف اس وقت ایک ہزار ایک سو اکتالیس سال کو پہنچ چکی ہے. یعنی عام انسانوں کی عمر سے چودہ گنا زیادہ.

تو سب سے پہلے ہم لفظ "امکان" کو لیتے ہیں. جس سے اس جگہ تین مفاہیم لئے جا سکتے ہیں.

(۱) امکان عملی (۲) امکان علمی یا سائنسی (۳) امکان منطقی یا فلسفیانہ

جہاں تک امکان عملی کا تعلق ہے. اس سے میری مراد ہماری آپ کے یا کسی اور کے لئے ایسی بات کا قوی امکان ہو کہ جس کے ذریعے کچھ ایجاد یا دریافت کیا جا سکے یا عملاً یا فعلاً کچھ کہا جا سکے مثلاً سمندر میں سفر کرنا، اس کی تہ میں اترنا یا چاند پر جانا ایسے مفروضے میں جن کا امکان عملی ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو گاہے بگاہے ایسی مشقیں کرتے رہتے ہیں.

امکان علمی سے مراد، کائنات میں کچھ ایسے تصورات ہیں جو ہمارے آپ کے لئے علمی لحاظ سے تو ممکن ہیں مگر خواہ ہم عملاً اس ترقی یافتہ دور کے جدید وسائل سمیت جس قدر کوشش کریں عملی لحاظ سے ممکن نہیں لیکن سائنس کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو ان تصورات کے امکانات کی نفی کرے مثلاً انسان کا زہرہ پر جانا۔ سائنسی اعتبار سے ممکن ہے کیونکہ اسکے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس امکان کی نفی کرے بلکہ موجودہ سائنسی آلات کی مدد سے زہرہ پر جانا ممکن نظر آتا ہے۔ کیونکہ زہرہ اور چاند پر جانے میں ایک حد تک فرق ہے جو ذرا اضافی محنت و کاوش کا متقاضی ہے۔ پس فی الحال "زہرہ پر جانا تو عملی طور پر" ناممکن ہے لیکن سائنسی اعتبار سے ممکن ہے اسکے برعکس آتش کدہ آفتاب پر جانا ناممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کو فی الحال کوئی امید نہیں کہ وہ کسی دن اس دہکتے ہوئے قرص شعلہ دار تک رسائی کرے گی کیونکہ سورج کی حدت سے محفوظ رہنے والی کسی شے کا بنانا فی الحال سائنس کیلئے ممکن نہیں

اب رہا منطقی و فلسفیانہ امکان، اگر کوئی مفروضہ، تجربہ سے ابھی تک نہ گزر پایا ہو مگر پھر بھی عقل اس کی صداقت پر دلیل کرے تو یہ امکان منطقی ہوگا۔ مثلاً تین اشیاء کا بغیر کسر لگائے مساوی طور پر تقسیم ہو جانا عقلی اعتبار سے ناممکن ہے۔ عقل تجربہ سے قبل اس حقیقت تک یوں پہنچتی ہے کہ تین طاق عدد ہے جو جفت نہیں۔ پس اس کا مساوی تقسیم ہونا ممکن نہیں کیونکہ طاق اعداد کی مساوی تقسیم ممکن نہیں ہوتی۔

لیکن عقلی اعتبار سے یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ حرارت والا جسم کم حرارت والے جسم کو نہ جلائے۔ اس مفروضے کے تحت انسان آگ یا سورج میں بھی جلنے سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن یہ تجربہ کے برعکس ہے کیونکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ حرارت زیادہ گرم شے سے کم گرم شے میں منتقل ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ منطقی امکان علمی یا سائنسی امکان سے اور علمی یا سائنسی امکان عملی امکان سے وسیع تر ہے۔

اس میں تو شک نہیں کہ کسی انسان کا ہزاروں سال زندہ رہنا منطقی اعتبار سے ممکن ہے۔ یعنی یہ بات محال نہیں اور نہ ہی تضاد ہے کیونکہ انسانی زندگی کا ہرگز مفہوم یہ نہیں کہ اسے ضرور جلد ہی فنا ہونا ہے اور نہ ہی اس سے اس کے عرصے کا کوئی تعین ہوتا ہے مگر اس میں بھی شک کی گنجائش نہیں کہ انسان کا ہزاروں سال زندہ رہنا عملاً غیر ممکن ہے کیونکہ سائنس ابھی تک اپنے جدید ترین آلات اور ترقی کے باوجود انسانی عمر میں اس حد تک اضافہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکی حالانکہ ہر سائنس دان کو فطری طور پر زیادہ عرصہ زندہ رہنے کی خواہش ہوتی ہے مگر ہر سائنس دان ایک معین عرصہ کے بعد مر جاتا ہے۔ بہرحال اس کا سائنسی امکان موجود ہے۔

انسانی بڑھاپے کی تفسیر یہ ہے کہ بڑھاپے کی ظاہری وجہ انسانی جسم کی ساخت لئے ایک فطری قانون ہے۔ جسم ایک حد تک بڑھنے کے بعد بتدریج کم ہونا شروع جاتا ہے اور کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اس کے معطل ہونے کا وقت آ پہنچتا ہے۔ جسمانی غیلوں کا اس طرح کم ہونا اپنے فزیالوجسٹ کے کام سرانجام دینے کا نتیجہ ہے یا خارجی اسباب سے مڈبھیڑ کا نتیجہ ہے۔ مثلاً جراثیم یا وہ زہر جو مضر غذا کھانے سے جمع ہوتے رہتے ہیں۔ پس اگر ہم سائنسی نظریے سے بڑھاپے کی ہی تفسیر کریں۔ تو ممکن ہے ہم انسانی جسم کے اعضاء و خلیات کو خارجی عوامل سے محفوظ رکھ کر زندگی کو بڑھاپے کے انتہا سے آگے بڑھالے جائیں۔ اور یہ کمزوری لاحق نہ ہو اور اگر بڑھاپے کی تفسیر ایک فطری قانون کا نتیجہ قرار دیں یعنی انسانی جسم کے خلیات اپنے اندر ایک حتمی فنا کو لئے ہوئے ہیں۔ اور بڑھاپے سے گزر کر انہیں فنا ہونا ہے۔ چنانچہ اب ہمارے پیش نظر دو نظریات ہیں۔ اوّل یہ کہ بڑھاپا جسمانی خلیات کا خارجی عوامل کے ساتھ ٹکراؤ اور متاثر ہونے کا نتیجہ اور اگر ہم ان خلیات کو خارجی عوامل سے محفوظ رکھیں تو انسانی عمر میں کئی گنا اضافہ ممکن ہے۔ جس سے ثابت ہوتا

ہے کہ انسانی زندگی کو صدیوں پر محیط کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک فطری و طبعی (فنا ہونے کا) قانون، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ طبعی قانون بے لچک ہے بلکہ وہ اس مفروضے کے باوجود لچک دار قانون ہے۔ کیونکہ ہم اپنی زندگی میں اور سائنس دان اپنی تجربہ گاہوں میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ بڑھاپے کا فزیالوجی کے اثر کے تحت کوئی معین زمانہ نہیں۔ یہ کبھی جلدی اور کبھی دیر میں رونما ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کئی افراد زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکے ہوتے ہیں مگر پھر بھی ان کے اعضاء تمام تر قوتوں سے۔ سرگرم ہوتے ہیں۔ اور بڑھاپے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ پھر ماہرین طب اور سائنس دانوں نے اس لچک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیوانات پر عملی تجربے کئے ہیں اور انکی طبعی عمر سے سینکڑوں گنا زیادہ عمر بڑھا دی ہے اس سے سائنسی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ خاص ماحول اور حالات پیدا کر کے عمر کو طولانی کرنا ممکن ہے۔ حیوان و انسان میں فقط ایک درجہ کا فرق ہے کہ ابھی تک سائنس دان اس بات پر قادر نہیں ہوئے کہ وہ انسان کو زیادہ دیر تک زندہ رکھ سکیں۔ اس کی وجہ انسانی سلسلے میں نسبتاً زیادہ محنت ہے۔ چنانچہ جب حیوانی زندگی میں اضافہ ممکن ہے تو انسانی زندگی میں بھی ناممکن نہیں۔ پس بڑھاپے کی تفسیر جو بھی کریں سائنس کسی انسان کی عمر کے طولانی ہونے کی نفی نہیں کرتی۔ خلاصہ یہ کہ انسانی عمر کا طویل تر ہونا منطقی و فلسفی اور سائنسی اعتبار سے ممکن ہے لیکن عملی اعتبار سے ابھی تک یہ بات دائرہ امکان سے باہر ہے۔ اب ہم حضرت مہدیؑ کی زندگی پر بات کرتے ہیں جو معرض سوال اور مقام تعجب بنی ہوئی ہے۔

سابقہ بحث کے مطابق لمبی عمر منطقی اور سائنسی اعتبار سے ممکن ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سائنس اس نظری اور فکری مفروضے کو عملی جامہ پہنانے کی سعی میں مصروف ہے مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود امام مہدیؑ کا وجود کس طرح سائنس سے سبقت لے گیا یعنی قبل اس کے کہ سائنس اس عملی نتیجہ پر پہنچتی ہے اس نے اس نظری و فکری امکان کو عملی جامہ اپنے وجود سے پہنا دیا یہ تو ای

طرح کہ سرطان کا مریض سائنس اور سائنس دانوں سے پہلے ہی اپنی دوا ایجاد کرلے اب مسئلہ یہ ہے کہ اسلام اس حوالے سے سائنس پر کس طرح سبقت لے گیا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام صرف اسی میدان ہی میں سبقت نہیں لے گیا بلکہ شریعت اسلامیہ تمام تر سائنس اور طبعی فکر انسانی پر سبقت رکھتی ہے۔ کیا اسلام نے صدیوں پہلے ایسے شعار نہیں دیئے جن میں انسان کے سامنے کئی منصوبے رکھے گئے اور ان تک انسانی رسائی بہت دیر میں ہوئی؟ کیا اسلام ایسے باحکمت قوانین نہیں لایا جن کے اسرار انسانی اذہان پر مدتوں بعد منکشف ہوئے۔ کیا آسمانی پیغامات نے بعض کائناتی اسرار و رموز نہیں کھولے۔ جن تک سائنس اب پہنچی ہے بہت سارے ایسے حقائق موجود ہیں جن کی تہ تک انسانی فہم و دانش ابھی تک نہیں پہنچی پس اگر ہم ان تمام پر ایمان لاتے ہیں تو پھر اللہ سبحانہ تعالےٰ کی جانب سے امام مہدیؑ کے وجود پر اور لمبی عمر پر تعجب کیسا؟ اس مقام پر میں فقط وہ حقائق، قوانین اور شعار بتا رہا ہوں جن میں اسلام نے سبقت حاصل کی اور ہم جن کا ادراک بھی کر سکتے ہیں، ہم اس کی مثال قرآن مجید کی اس خبر سے دیتے ہیں جس کے مطابق نبی کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک سیر کرائی گئی اگر ہم اس بات کو طبعی و فکری قوانین کی مدد سے پرکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اس نتیجہ پر سینکڑوں سال بعد پہنچی پس خود اللہ سبحانہ کی طرف سے یہ اطلاع کہ اس نے بندے کو سیر کرائی اس بات کے امکان کا ثبوت ہے چنانچہ اس ذات کا اپنے آخری ہادی و مہدی کے بارے میں لمبی عمر عطا کرنے کی خبر دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے واسطے اتنی لمبی عمر ممکن ہے عوام الناس میں معروف حد تک زندگی بہت کم ہے لہٰذا اس نجات دہندہ قائد منتظر کی طولانی زندگی کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ سائنس دانوں کے تجربات بھی اس طولانی پن کو نہیں اپنا سکے لیکن کیا وہ معروف عام تغیر و تبدل یا عظیم کام جو اس عظیم قائد کے ذمہ ہے عجیب معلوم نہیں ہوتا؟ وہ تاریخی ادوار جو ماضی کا حصہ بن چکے ہیں اور پوری

کائنات کا نظام جس کا اس پر انحصار ہے پھر عدل، انصاف اور حق کی بنیاد پر معاشرتی تہذیب و تمدن کی از سر نو تعمیر کرنا ہے پس ہم کیوں تعجب کا شکار ہوتے ہیں جبکہ اس قائد کے بارے میں بعض غیر معروف باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً عمر کا طولانی ہونا وغیرہ، چنانچہ جب ہم تاریخی اعتبار سے اس بات کے معتقد ہیں کہ اتنی بڑی تبدیلی جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی ایک قائد سر انجام دے گا تو پھر ہمیں اس کی عمر کے طولانی ہونے میں متعجب نہیں ہونا چاہیئے اگرچہ ہمارے معروف مشاہدہ میں اتنی لمبی عمر کا انسان نہیں پایا جاتا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ دو اشخاص جن کے ذمہ دنیا کو فساد سے محفوظ رکھنا قرار دیا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک طویل عمر پاتا ہے جو معروف حد زندگی سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک جس نے اپنے کام کو ماضی میں سر انجام دیا۔ حضرت نوحؑ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ساڑھے نو سو سال تک اپنی امت میں موجود رہے اور پھر معروف طوفان نوح کے ذریعے پورے نظام کو از سر نو بدلنے میں کامیاب ہوئے۔ اور ان میں دوسرا اپنے فرض و ذمہ داری پر مستقبل میں عمل کرے گا اور وہ تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اپنی قوم میں موجود ہے اور وہ ہے امام مہدیؑ بس عنقریب اس کی آمد کے اسباب مہیا ہوں گے اور وہ اس قابل ہو گا کہ فسق و فجور سے تاریک دنیا کو عدل و انصاف کی شمع سے روشن کرے اور باطل قوتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دے۔ پس یہ تضاد چہ معنی دارد؟ کہ حضرت نوح کی طویل عمر کو تو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن حضرت مہدیؑ کی عمر کے سلسلے میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔

معجزہ اور لمبی عمر

ہم طے کر چکے ہیں کہ سائنسی اعتبار سے صدیوں پر محیط عمر ممکن ہے لیکن اب ہم فرض کرتے ہیں کہ یہ عملی اعتبار سے ناممکن ہے اور بڑھاپے کا قانون نہ ٹوٹنے والا ہے نیز آج اور آنے والے کل کے انسان کے لئے اس قانون پر غلبہ ممکن نہیں تو پھر طولانی عمر چہ معنی دارد، مثلاً نوح علیہ السلام یا جناب مہدی علیہ السلام کا صدیوں زندہ رہنا دالظاہر طبعی قوانین کے خلاف ہے۔ وہ طبعی قوانین جنہیں سائنسی تجربات، جدید تحقیقات اور دیگر مختلف طریقوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ ایک معجزہ ہوگا۔ جس نے ایک معین حالت میں اس طبعی قانون کو معطل کر دیا ہے اور ایک ایسے شخص کو محفوظ کر دیا ہے جس کے ذمے آسمانی پیغام کی حفاظت ہے۔ یہ معجزہ اپنی نوع میں ہرگز تنہا یا منفرد نہیں اور نہ ہی اسلامی عقیدہ رکھنے والوں کے لئے باعث تعجب ہے کیونکہ وہ مسلمان جو قرآن و سنت کے حوالے سے عقائد قائم کرتے ہیں بڑھاپے کے قانون کو زیادہ گرم جسم سے حرارت کا تھوڑے گرم جسم کی طرف انتقال کے قانون سے زیادہ سخت نہیں پاتے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم کی زندگی اس قانون کے تسلط پر منحصر تھی تو اس قانون کو معطل کر دیا گیا اور حضرت ابراہیمؑ آگ

میں ڈالے گئے تو وہ گلزار ہو گئی جیسا کہ قرآن میں ارشاد رب العزت ہے۔

قلنا ینار کونی بردًا وّسلامًا علیٰ ابراھیم

ترجمہ: ہم نے کہا اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔ سورۃ الانبیاء

پس حضرت ابراہیم کو آگ سے محفوظ رکھا گیا اور اس طرح اور بھی بہت سے طبعی قوانین کو اکثر انبیاء علیہم السلام کی حمایت میں (جو زمین پر حجت خدا تھے) توڑا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے سمندر کو دو لخت کیا گیا۔ جناب عیسیٰؑ کو رومانیوں کی نظروں کے سامنے ان کی پکڑ سے محفوظ کیا گیا۔ قریش مکہ کے بڑے بڑے سورماؤں کے محاصرے کے باوجود حضورؐ کو بخیر و عافیت اور ان کے ارادوں سے محفوظ رکھتے ہوئے گھر سے نکالا گیا۔ یہ تمام واقعات و حالات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ حکمت خداوندی کے مطابق ان ہستیوں کو شر اعداء سے محفوظ رکھنے کے لئے طبعی قوانین کو معطل کیا گیا۔ پس بڑھاپے کا طبعی قانون بھی اسی طرح حکمت خداوندی کے لئے معطل ہو سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان تمام واقعات و حالات کی روشنی میں ہم یہ قانون اخذ کر سکتے ہیں کہ جب بھی زمین پر حجت خدا کی زندگی کا تحفظ کسی طبعی قانون کی معطلی پر موقوف ہو اور اس شخص کی زندگی کسی اہم فریضہ کے لئے بچانا مقصود ہو تو رب ذوالجلال اس مقصد کے لئے طبعی قوانین معطل کر دیتا ہے تاکہ وہ شخص معینہ وقت میں اس فریضہ کی ادائیگی کر سکے اور اس کے برعکس جب اس حجت خدا کا وہ کام جس کے لئے اسے مبعوث کیا گیا تھا ختم ہو جاتا ہے تو طبعی قوانین کے مطابق وفات پا جاتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے۔

اس عام مفہوم کے ضمن میں ہمیں ایک اور سوال کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ایک طبعی قانون کو کس طرح توڑا یا معطل کیا جا سکتا ہے؟ اور طبیعت کے مظاہر میں جو ربط و تعلق ہے اس کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے کیا یہ سائنسی نظریات کے مخالف نہیں؟ ہم اس کے جواب میں

طبعی قوانین کے سلسلے میں سائنس کا ہی اختیار کردہ نظریہ اقتباسات پیش کریں گے۔

اور اس کی وضاحت یوں ہوگی کہ سائنس تمام تر طبعی قوانین تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اخذ کرتی اور بناتی ہے یعنی سائنس جب کسی چیز میں یہ مشاہدہ یا تجربہ کرتی ہے کہ فلاں چیز ہمیشہ اس سبب سے وجود میں آتی ہے یا ہمیشہ اس شے کے وجود میں آنے سے دوسری شے وجود میں آجاتی ہے تو وہ اس مشاہدہ کی روشنی میں ایک طبعی قانون بنا دیتی ہے لیکن سائنس اس طبعی قانون میں دو چیزوں کے درمیان اس تعلق کو حتمی نہیں سمجھتی اور نہ ان اشیاء کے درمیان یہ رابطہ حقیقی واقعی ہے اور یہ کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک غیبی امر ہے اور سائنسی تجربات، استقراء اور مشاہدات سے اس غیبی حالت کو نہیں سمجھا جا سکتا یا بالفاظ دیگر سائنس میں ابھی اس قدر وسعت نہیں کہ اس کی مدد سے غیبی حالت کو سمجھا جا سکے۔ علم جدید یعنی سائنس کے مطابق طبعی قانون کی رو سے دو اشیاء کے درمیان ضروری اور حتمی تعلق و رابطے کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ جب دو اشیاء کے درمیان اس طرح مسلسل اتصال کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ایک شے کے بعد دوسری شے موجود ہو جاتی ہے اور بار بار اس مشاہدے کی تکرار ہوتی ہے تو اس مظاہر کو دیکھ کر اس سے ایک عمومی اور ظاہری قانون بنا لیا جاتا ہے۔

پس اگر کوئی معجزہ ان دو اشیاء کو جن کا آپس میں گہرا ربط و تعلق ہے ایک دوسرے سے جدا کر دے تو در حقیقت اس مقام پر ان کے درمیان حقیقی و حتمی تعلق کو نہیں توڑا گیا کیونکہ ان کے درمیان کا حقیقی اور واقعی تعلق تو ایک غیبی امر ہے کہ جسے ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم نے تو ان دو اشیاء کے ایک دوسرے کے بعد آنے کی تکرار سے ان کے درمیان ایک ظاہری ربط و میلان کو کشف کیا تھا۔ اور اسی ظاہری امر کی بناء پر ایک عام قانون اخذ کیا تھا پس جب مصلحت ایزدی سے ان دو اشیاء میں علیحدگی واقع ہوئی تو ہم جان گئے کہ ان کے درمیان وہ ظاہری تعلق حقیقی نہیں تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ سائنسی ترقی کی اس منزل پر اس قسم کے معجزات

کی تصدیق بڑی آسان اور پہلے کی نسبت زیادہ قابل فہم ہوگئی ہے کیونکہ زمانۂ قدیم کے علماء اس نظریئے کے قائل تھے کہ جب دو چیزیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے بعد خارج میں موجود پائیں اس طرح کہ جب ان میں سے ایک موجود ہو جائے۔ تو دوسری بھی خارج میں موجود ہو تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دو چیزوں میں ایک حقیقی و واقعی ربط و تعلق ہے اور ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا محال ہے لیکن جدید سائنس کی منطق میں اس رابطے کے بارے میں بغیر اس کے کہ وہ دو چیزوں کے درمیان ایک غیبی مزید رابطے کو فرض کریں۔ دو چیزوں کے آپس میں مسلسل اتصال کو قانون اتصال کا نام دیتے ہیں۔ ایسی دو چیزیں جن کا آپس میں مسلسل اتصال ہو اگر معجزہ ان میں علیحدگی ڈال دے تو یہ قانون کی استثنائی صورت ہوگی۔

بہرحال استقراء کے منطقی اصولوں کی بنیاد پر اس نظریئے کا اثبات بالکل آسان ہے اور وہ اس طرح کہ ہم استقراء کی تفسیر کے متعلق جدید نظریات سے بالکل متفق ہیں جن کے مطابق استقراء خارج میں دو چیزوں کا ایک دوسرے کے بعد واقع ہونے پر ان دو چیزوں کے درمیان حتمی و لازمی تعلق و رابطہ پر دلیل قائم نہیں کرتا، لیکن دو چیزوں کا آپس میں مسلسل اتصال ایک ایسی مشترک تعبیر کرتا ہے جس میں ممکن ہے کہ اس اتصال کے لئے ایک ضروری اور حتمی تعلق کو فرض کر لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ منظم کائنات کی حکمت نے یہ اقتضاء کی ہو کہ اس نے ان دونوں کے درمیان اتصال کو حتمی ضرورت کی بنیاد پہ نہ رکھا ہو اور یہی حکمت جو کبھی اس بات کی متقاضی ہو سکتی ہے کہ ان چیزوں کے درمیان اتصال کو ختم کر دیا جائے پس اب کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہتا۔

اور خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح معجزہ دینی مفہوم کے اعتبار سے عقلاً ممکن ہے اسی طرح جدید سائنس کی منطق میں بھی نہ صرف اس کا امکان موجود ہے بلکہ اس حقیقت کو موجودہ زمانے میں از منۂ قدیم کی نسبت سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔

یہ سارا اہتمام اس ایک ذات کی خاطر کیوں؟

اب ہم دوسرے سوال کو موضوع بحث بناتے ہیں کہ پروردگار کی جانب سے یہ تمام تر اہتمام ایک خاص انسان کے لئے کیوں؟ اور کس لئے اس کی عمر کو طول دینے کے لئے طبعی قوانین معطل کئے گئے؟ اس موعود رہبری کو کسی آئندہ پیدا ہونے والی شخصیت کے سپرد کیوں نہ کر دیا گیا؟ کہ یوم ظہور کی اچھائیاں اسے مضبوط بناتیں اور وہ میدان عمل میں کود پڑتا نیز اس قدر طویل غیبت کا جواز اور فائدہ کیا ہے؟

یہ سوال اٹھانے والے بہت سے لوگ اس کا غیبی جواب نہیں سننا چاہتے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بارہ آئمہ علیہم السلام ایسے در نایاب ہیں کہ جن کا بدل محال و ناممکن ہے لیکن سوال کرنے والے اشخاص اس نظریئے کی ایک اجتماعی تفسیر چاہتے ہیں۔ اور تبدیلی لانے کے اسباب و اثرات اور یوم موعود کے عام فہم معانی کی روشنی میں اپنے سوال کا جواب چاہتے ہیں

اس لئے ہم وقتی طور پر اس عقیدہ سے صرف نظر کرتے ہیں جو ہم ان آئمہ علیہم السلام کے بارے میں رکھتے ہیں اور ان شرائط سے بھی جو ان آئمہ میں ہونا ضروری کہتے ہیں اور اس سوال کو اس صورت میں پیش کرتے ہیں ۔

یقیناً ایسی تبدیلی جو یوم موعود کو رونما ہوگی اور جس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ زندگی کے ان مفاہیم اور تجربوں کی روشنی جو کچھ ہم سمجھتے ہیں کیا ہم اس قائد و رہبر کی لمبی عمر کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکی یہ طویل عمر اک عظیم کام میں مفید ثابت ہوگی اور اس بڑی تبدیلی لانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں۔

ہم اس سوال کا جواب اور اس کی وجوہات درج ذیل ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

بے شک یہ بڑی تبدیلی جو اس عظیم رہبر کے ذریعے عمل میں آنی ہے یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کو انجام دینے والا ایک مخصوص نفسی حالت کا مالک ہو اور یہ نفسی حالت اس میں مختلف تہذیبوں اور تمدنوں میں زندگی گزارنے سے پیدا ہوگی اور اس کو بڑی بڑی تہذیبوں کی ابتداء اور پھر ان کے زوال اور زوال کے اسباب کا علم ہوگا اور جس کے نتیجے میں وہ نفسیاتی طور پر ایک نئی تہذیب قائم کرنے میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ ان گزشتہ فاسد اور مہمل تہذیبوں (جن میں زندگی گزار چکا ہے) سے وہ جس قدر بے زار ہوگا اسی قدر وہ ان کی جگہ ایک نئی تہذیب کے قیام میں دلچسپی لے گا اور اس کے سابقہ مشاہدات کی روشنی میں یہ نئی تبدیلی لانے میں اس کے لئے کامیابی کے امکانات کافی روشن ہوں گے اور وہ اس تبدیلی کے عمل کی مکمل کامیابی تک مصروف رہے گا۔

اور یہ واضح ہے کہ اس مطلوبہ احساس کا حجم اور معیار اس تبدیلی کے حجم اور معیار کے مطابق ہونا چاہیئے ایک وسیع و عریض طویل اور مضبوط تہذیب کو اس رہبر نے بدلنا ہے اس لئے اس قائد و رہبر کے نفسی شعور کا بھی مضبوط اور بھرپور ہونا ضروری ہے۔ جب یوم موعود ظلم و ستم سے بھری دنیا کے لئے ایک ایسی تبدیلی کا پیغام ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں رونما ہوگی تو ضروری ہے کہ اس پیغام کا حامل شعوری، احساساتی اور معلوماتی اعتبار سے اس پوری دنیا سے

عظیم اور قدآور انسان ہو وہ ایسی نسل میں سے نہ ہو جس کی نگہداشت اسی زمانہ اور تہذیب کے زیر سایہ ہوئی ہو جس کی تبدیلی مقصود ہے۔ جسے عدل و انصاف اور حق کی بنیادوں پر استوار تہذیب سے بدلنا ہو کیونکہ اس کی معلومات اسی تہذیب اور ماحول تک محدود ہوں گی جس میں وہ پروان چڑھا ہوگا۔ اس کو صرف ظلم و ستم سے معمور اسی تہذیب کے بارے میں علم ہوگا جس میں اس نے آنکھ کھولی۔

اس کے برعکس وہ شخص جس نے طویل عرصہ کی زندگی میں کئی تہذیبوں کے عروج و زوال اور ابتداء و انتہاء کا مشاہدہ کیا ہو۔ تاریخ بشریت میں ید طولیٰ کا مالک ہو۔ جو تمام حالات و واقعات کا چشم دید گواہ ہو جس نے یوم موعود سے پہلے معاشرتی اقدار اور نظاموں اور ارتقاء کو اس وقت سے دیکھا ہو جب وہ ایک بیج کی مثل تھے۔ پھر اس نے اس کی نشوونما کے مراحل دیکھے ہوں اور یہ مشاہدہ کیا ہو کہ یہ موجودہ فاسد نظام کس طرح بڑھا اور ہر مرحلہ کا بوقت وقت اور غور و فکر سے مطالعہ کیا ہو وہ اس وسیع و عریض تہذیب کو نزدیک سے دیکھتا ہے جس سے وہ ٹکر لینا چاہتا ہے۔ اس نے حالات و واقعات کی روشنی تاریخ انسانیت کا مکمل مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ پوری انسانی تاریخ میں ہے اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کی معلومات کتب کے مطالعہ پر موقوف نہیں اور ان واقعات کو تقدیر الٰہی سمجھتا ہو جس طرح جان جیک روسو فرانس میں قائم بادشاہت کی طرف دیکھتا ہے۔ اس سے یہ قول نقل ہوا ہے کہ وہ جب فرانس کو بغیر بادشاہت کے سوچتا تو اس پر ایک خوف طاری ہو جاتا جبکہ وہ اس نظام کو بدلنے والے بڑے بڑے مفکرین میں سے ایک تھا۔ جس نے فلسفیانہ اور فکری طور سے اس معاشرہ کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ اس لئے تھا کہ وہ (روسو) بادشاہی نظام میں پیدا ہوا اور اپنی پوری زندگی بادشاہت میں گزاری۔ لیکن یہ شخص جو پوری تاریخ انسانی ند شامل رہے اس کے پاس تاریخ کی ہیبت و قوت اور ایک مضبوط احساس و شعور ہے کہ جو ماحول

وتہذیب اس کے گرد قائم ہے یہ ایام گذشتہ میں ایک دن کی پیداوار ہے جب اس کے لئے اسباب پیدا ہوئے یہ قائم ہوگئی اور عنقریب جب دوسرے اسباب مہیا ہوں گے یہ زائل وختم ہوجائے گی۔ اس کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ جس طرح ماضی قریب یا ماضی بعید میں اس کا نام ونشان تک نہ تھا مختلف تہذیبوں اور نظاموں کی طویل عمریں بھی پوری تاریخ کے اعتبار سے چند گنے چنے دنوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آپ نے سورہ کہف پڑھی ہوگی اس میں اُن نوجوانوں کا ذکر پڑھا ہوگا جو اپنے رب پر ایمان لائے اور اللہ تعالٰی نے اُن کی ہدایات میں مزید اضافہ کردیا ان کا سامنا ایک ایسی بت پرست حکومت سے تھا جو کسی پر رحم نہیں کرتی تھی اور توحید کے خاتمے پر ہر طرح سے تلی ہوئی تھی۔ وہ شرک کی پستیوں سے نکل کر توحید کی بلندیوں پر پہنچنے والے کسی بھی شخص کو معاف نہ کرتی پس اُن نوجوانوں کے قلوب ونفوس پر مایوسی کی دھند چھا گئی۔ امید کے تمام دروازے ان پر بند ہوگئے ہو انہوں نے ایک غار میں

پناہ لی اور اللہ تعالٰی سے اپنی مشکل کا حل مانگا کیونکہ ان کے تمام حل ناکام ہوچکے تھے۔ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ باطل کو شاید ہمیشگی حاصل ہے اور ظلم وستم ہمیشہ کے لئے یونہی جاری رہے گا۔ حق مغلوب ہوتا رہے گا اور داعیان حق اسی طرح جور وستم کا شکار رہیں گے۔

آپ کو ان کے ساتھ اللہ تعالٰی کا برتاؤ بھی معلوم ہوگا کہ انہیں تین سو نو سال کے لئے اس غار میں سلادیا گیا۔ ں میں انہوں نے پناہ لی ہوئی تھی اور پھر اس مدت کے بعد ان کو بیدار کیا اور میدان زندگی میں لایا اور اس وقت وہ حکومت جو ان نوجوانوں کو انتہائی طاقت ور اور ناقابل شکست محسوس ہوتی تھی ختم ہوچکی تھی اور ریزہ ریزہ ہوکر قعر گمنامی میں بکھر چکی تھی وہ ایک ایسی تاریخ کا روپ دھار چکی تھی جس سے کسی کو کوئی ڈر

خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی کسی ساکن کو حرکت دے سکتی تھی اور وہ نہ ہی کسی متحرک کو ساکن کرسکتی تھی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ وہ نوجوان اس باطل قوت کے فنا اور اختتام ہوجانے کی حقیقت دیکھ لیں جس کا طولانی پن ان کے لئے بار گراں تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس کا انجام دیکھ لیا اور اس طرح باطل اُن کی نظروں میں حقیر وذلیل ہوگیا اور تحقیق وہ بات جو اس قدر مصیبتوں اور تکالیف کو جھیلنے اور تین سو نو سال تک حکم ربی سے سوئے رہنے کے بعد اصحاب کہف کے مشاہدے میں آئی یہ تھی کہ جب بیدار ہوئے تو نہ وہ جابلانہ نظام ہے نہ جابر حکومت۔ تحقیق بالکل اسی طرح یہی بات اس قائد منتظر کے لئے بھی ہے جو اپنی اس طویل عمر میں بڑی ظالم وجابر حکومتوں کا مشاہدہ کرتا آیا ہے ان کی ابتداء وانجام سے آگاہ ہے۔ اس نے ان حکومتوں کو بنیاد سے لے کر ان کے مٹ جانے تک دیکھا ہے وہ ان تمام واقعات کا عینی شاہد ہے۔ تہذیبوں اور حکومتوں کے زوال کے اس مشاہدے سے اس کی فکر میں پختگی اور یوم موعود کی قیادت کی زیادہ سے زیادہ قابلیت واستعداد پیدا ہوجائے گی۔ کیونکہ یہ قائد دوسروں کے تجربات سے مشاہدات حاصل کرچکا ہوگا اور ان کے ضعیف نکات کا بھی اسے علم ہوچکا ہوگا اب وہ ایک بڑی تبدیلی کا پروگرام بناتے ہوئے ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تبدیلی کے عمل کو شروع کرے گا ظاہر ہے اس صورت میں اس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن بلکہ سو فیصد ہوں گے۔

اس خاص شخصیت کا پروگرام ایک پیغام کو عملی جامہ پہنانا بھی ہے اور وہ پیغام ہے دین اسلام، یہ فطری اور طبعی بات ہے کہ اس کام کے لئے قائد ورہبر ایسا ہونا چاہیئے جو دین اسلام کے حقیقی منبع ومرکز کے قریب ترین ہو اور اس شخصیت کی تربیت استقلال کی بنیادوں پر ہوئی ہو وہ کسی تہذیب وتمدن سے متاثر نہ ہو اور نہ ہی ایسے نظاموں

کا اس پر کوئی اثر ہو جن کو اس نے یوم موعود میں بدلنا ہے۔ برخلاف اس شخص کے جو اسی تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہوا ہو اور اس کے افکار و خیالات و احساسات اسی تہذیب میں پروان چڑھے ہوں۔ یہ طے ہے کہ ایسا شخص اس تہذیب کے اثرات سے محفوظ نہیں ہو گا اگرچہ وہ اس کے خلاف ایک بڑی تبدیلی لانے کی قیادت ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ پس وہ شخصیت جسے اس بلند سطح کی تبدیلی لانی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی طور سے ان نظاموں سے متاثر نہ ہو جنہیں اسے بدلنا ہے نہ ہی ان تہذیبوں، معاشرے اور ماحول کا فرزند ہو۔ نیز ایسی شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو وہ اس زمانے کے زیادہ نزدیک ہو جس میں اسلام کے حقیقی بانی اور مبلغ موجود تھے۔ دوسری طرف وہ یوم موعود میں جن نظاموں اور تمدنوں کو بدلنا چاہتا ہے ان سے بالکل متاثر نہ ہو بلکہ ان نظاموں سے دور رہتے ہوئے ان کے نشیب و فراز کا بغور مطالعہ کرتا رہا ہو اور ان کے عیوب و نقائص کو دیکھتا رہا ہو اور پھر جب وہ نیا معاشرہ قائم کرنا چاہے تو وہ ایسا ہو جیسا کہ صحیح اسلامی معاشرہ ہوتا ہے جس کے لئے وہ انتظار میں ہے اور وہ اپنے سینکڑوں سالوں کے تجربہ کی روشنی میں یہ نظام قائم کرے گا۔ یہ تھا وہ اہم مقصد جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اس شخصیت کے لئے قانونِ فطرت کو بدلا۔

تکمیل قیادت

اب ہم تیسرے سوال پر گفتگو کرتے ہیں جس میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ قائد منتظر نے اپنے والد کی ہمراہی میں پانچ سال کا عرصہ گزارا ہے اور یہ زمانہ عہد طفلی کہلاتا ہے اور اس دور میں کسی کو بھی اس عظیم الشان قیادت کے لئے تیار کرنا محال ہے تو وہ کون سے عوامل اور حالات تھے جن کی بناء پر یہ قائد اس قدر بڑی تحریک کی قیادت کا اہل ہوا اور اس عظیم الشان قیادت کی تمام شرائط اس کی ذات میں مکمل ہو گئیں۔

جواب ، حضرت مہدی علیہ السلام کو اپنے والد کی جانب سے اس کمسنی میں اپنے بعد امام نامزد کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ میں وہ تمام شرائط موجود تھیں جو کسی شخصیت میں واجب الاطاعت امام بننے کے لئے درکار ہوتی ہیں آپ میں تمام روحانی اور فکری صلاحیتیں بچپن ہی سے موجود تھیں۔ نیز اس کمسنی میں اس عہدہ کا ملنا اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد واقعہ نہیں بلکہ آپ کے آباؤ اجداد میں پہلے بھی اس کی مثال موجود تھی حضرت امام محمد بن علی الجواد علیہ السلام آٹھ برس کی عمر میں مسند امامت پر متمکن ہوئے۔ جناب امام علی بن محمد الہادی علیہ السلام کو نو سال کی عمر میں امامت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان کے علاوہ

جناب مہدی علیہ السلام کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام ۲۲ سال کی عمر میں درجۂ امامت پر فائز ہوئے۔

آپ اور آپ سے قبل آپ کے جد امام محمد الجواد کو اس کم عمری میں اس عظیم عہدہ کا ملنا اس بات کی عملی تفسیر ہے کہ یہ منصب کم سنی میں بھی مل سکتا ہے۔ مسلمانوں کے واسطے اس عمر میں اتنا بڑا منصب مل جانا کوئی اچھوتی بات نہیں تھی کیونکہ وہ اس کا مشاہدہ اور تجربہ آپ سے قبل آپ کے آباؤ اجداد میں کر چکے تھے بلکہ آئمہ کے ہم عصر مسلمانوں نے آپ کے اس دعویٰ کو بلاوجہ ہی تسلیم نہیں کر لیا تمام مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا دعویٰ کرنا آسان بات نہ تھی چنانچہ جب ہمارے کسی امام نے یہ دعویٰ کیا تو پھر خود کو ہر آزمائش امتحان اور تجربے کے لئے آمادہ رکھا اور عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ تمام ہم عصر مسلمان علماء و مفکرین سے ہر عمل و علم میں برتر و افضل ہیں پس کمسنی میں اس منصب پر فائز ہونے کے لئے اس سے بڑی اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے۔

اس مطلب کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مقام پر چند نکات پیش کرتے ہیں۔

الف اہل بیت علیہم السلام میں سے نہ تو کسی کی امامت ،حکومت و سلطنت کا مرکز تھی اور نہ ہی انہیں منصب امامت اور عوام میں اثر و رسوخ عام حکمرانوں کی طرح ورثے میں ملا تھا کہ باپ کی طرف سے عنان حکومت بیٹے کی طرف منتقل ہوتی ہو اور یہ وراثت حکومت کو مضبوط بنا رہی ہو جیسا کہ فاطمی، عباسی اور اموی خلفاء میں مروج تھا۔

آئمہ علیہم السلام سے عوامی محبت و حمایت کا سبب ان کی جانب سے عوام الناس کو روحانی اور فکری غذا اور خصوصاً اہل علم کو فکری و روحانی دولت سے مالا مال کرنا تھا ان حضرات نے اپنے علم و عمل اور سیرت و کردار سے عوام الناس اور اہل علم پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس عظیم منصب الٰہی کے حق دار اور سزاوار ہیں اور ان کی قیادت روحانی و فکری

بنیادوں پر استوار ہے۔

ب ، یوں تو ابتدائے اسلام ہی سے صاحبان علم و دانش موجود تھے لیکن امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ علمی و فکری تحقیق و مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا اور جس نظریہ و مکتب کی تدریس ان دو آئمہ نے کی وہ عام لوگوں اور اہل علم میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ آپ کی تعلیمات کسی مخصوص عنوان یا نصاب میں محدود نہیں تھیں بلکہ آپ کا مدرسہ ہر مکتب فکر کے علماء پر مشتمل تھا اور ہر شعبۂ علم کے طالبان آپ کے فیض سے تشنگی اذہان بجھا رہے تھے۔ اس مدرسہ نے عالم اسلام کو نہ صرف سینکڑوں فقہا ، محدثین ،متکلمین اور مفسرین عطا کئے بلکہ ایک بہت بڑی تعداد میں جدید علوم کے ماہرین بھی تیار کئے جن پہ آج بھی اسلام بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ ماہرین کیمسٹری فزکس ، جیومیٹری ، الجبرا اور دیگر ان گنت علوم پہ دسترس حاصل کرتے اور انہیں عوام الناس تک پہنچانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس مدرسہ کی وسعت کا اندازہ حسن بن علی الوشا کے اس بیان سے لگائیے کہ

"جب میں مسجد کوفہ میں داخل ہوا تو میں نے ایسے نو سو بزرگ دیکھے جو سب کے سب یہ فرما رہے تھے کہ ہمیں (جناب) جعفر بن محمد (علیہ السلام) نے بتایا ہے۔"

ج ، اس مدرسے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے عوامی قیادت مہیا کرنے کا بھی ذمہ لے رکھا تھا اور اس سے متعلق افراد کا نظریہ یہ تھا کہ عوامی قیادت کا اہل وہی شخص ہے جو اپنے ہم عصر تمام علماء سے فکر و عمل اور تدبر و حکمت میں برتر ہو، اور یہ تمام افراد اس نظریہ پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ امام اور عوامی قائد وہ ہو سکتا ہے جو تمام لوگوں سے علم و عمل و فکر و سیاست اور اعلیٰ اوصاف میں افضل ہو۔

د اور اس مکتب فکر سے متعلق افراد اس فکر کی بقا اور سلامتی اور حمایت میں کسی

قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے اور اسی کی بنیاد پر وہ ہمعصر خلافت کے فکری اور نظریاتی طور پر خلاف تھے اور اسی وجہ سے اس خلافت کی مسند پر متمکن ان حضرات کے جانی دشمن تھے اور انہوں نے اس نعرۂ حق کو دبانے کے لئے آخری حربہ کے طور پر قتل و غارت گری سے بھی دریغ نہ کیا۔ ظلم و ستم، جبر و تشدد اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا اس مکتب فکر کی حمایت کے جرم میں لوگوں کو زندانوں میں ڈالا گیا۔ اس اعتبار سے عوام کو آئمہ طاہرینؑ سے محبت کا بہت بڑا معاوضہ دینا پڑا۔ لیکن یہ حقیقت باعث تعجب ہے کہ ان تمام استبدادی کارروائیوں کے باوجود محبان آل محمد علیہم السلام نے تمام قربانیاں دیں مگر دامن آل محمد علیہم السلام سے دستبرداری گوارا نہ کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ دکھ اور اذیتیں عارضی ہیں درحقیقت یہی راہ نجات ہے سو وہ ہر لالچ سے بالاتر ہو کر محاذ حق پر ڈٹے رہے اور اہل بیت علیہم السلام پر پروانہ وار قربان ہوتے رہے اور ان کے اس عمل کی اساس یہ عقیدہ تھا کہ قرب الٰہی کا ذریعہ محبت آل محمد علیہم السلام ہے۔

۷ ۔ عوامی اطاعت کی محور و مرکز یہ ہستیاں بھی ہرگز عوام سے الگ نہ تھیں اور نہ ہی دنیاوی حکمرانوں کی طرح قصر عالیشان میں رہائش پذیر اور نہ ہی بلند و بالا شاہی تختوں پر براجمان تھیں۔ آئمہ علیہم السلام اپنے محبان سے نہ ہی دوری اختیار کرتے تھے۔ اور نہ ہی منظر عام سے غائب ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ حکمران انہیں شہر بدر کر دیتے یا جیل میں قید کر کے عوام الناس کی نگاہوں سے اوجھل کرتے تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں راویوں اور محدثین کی روایات اور خود آئمہ علیہم السلام کے مکاتیب و مراسلات سے مل سکتا ہے آئمہ علیہم السلام عوام کو علوم الٰہی سے فیض یاب کرنے کے لئے گرد و نواح میں سفر بھی کرتے اور دوسرے شہروں اور بستیوں میں اپنے وکلاء بھی روانہ فرماتے تھے۔ شیعوں کو بھی آئمہ سے اس درجہ محبت و عقیدت تھی کہ وہ مزارات مقدسہ کی زیارات یا حج پر جاتے تو تلاش و جستجو سے آئمہ علیہم السلام کی زیارت کیا کرتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے

کسی قربانی سے گریز نہ کرتے۔ یہ تمام واقعات و حالات آئمہ طاہرینؑ اور ان کے محبین و ارادتمندوں کے درمیان قائم مضبوط تعلق اور امامیہ مکتب فکر سے عوام کی گہری وابستگی کے واضح و روشن دلائل ہیں۔

۹ ۔ آئمہ اہل بیت کی ہم عصر خلافت کو ان نظریات و تعلیمات کی روشنی میں اپنا تخت ڈولتا دکھائی دیتا اور وہ سمجھتے کہ ان نظریات و عقائد کی ترویج ان کی سلطنت و حکومت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ چنانچہ وہ حکومتیں محض اپنے تاج و تخت کے تحفظ کے لئے اس حقیقی قیادت کے خاتمے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتیں اور ہر قسم کا منفی حربہ استعمال کرتیں جب وہ علمی و عملی یا کسی دوسرے ذریعے سے ان کی عوامی مقبولیت پہ کوئی زد نہ پہنچا سکتیں تو جبر و تشدد اور قتل و غارت گری کی راہ اختیار کر لے۔ دین حق کو مٹانے کے لئے آئمہ علیہم السلام کو زندانوں میں ہر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا اور عوام کے ساتھ ان کے رابطے اور تعلق کو منقطع کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی لیکن حکومت کی ان تمام کوششوں کا عوام پر ردعمل ان کی توقعات کے برعکس ہوتا اور عوام میں حکومت کے خلاف نفرت و غصہ میں مزید اضافہ ہوتا اور یہ حکومتی جبر و استبداد آخرکار آئمہ علیہم السلام کو شہادت تک پہنچا دیتے اور عوام تڑپ اٹھتے۔

اگر ہم واضح اور محکم حقائق پر مشتمل ان چھ نکات کا مطالعہ کریں کہ جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ کسی کا درجہ امامت پر فائز ہونا کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ یہ ایک واضح و روشن حقیقت ہے امام وقت پوری آب و تاب اور اعلان کے ساتھ دعویٰ امامت فرماتے تھے۔ عوام ایک کثیر تعداد میں ان کی حمایت اور ان پر جانیں نثار کرنے کو آمادہ ہوتی تھی۔ امام وقت کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام عالم میں علم و معرفت، تقویٰ و شجاعت اور فکری وسعت میں سب سے بلند تر ہو، فقہی

مسائل و تفسیر اور عقائد پر بھرپور دسترس رکھتا ہو۔ اگر ان میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو وہ اس قدر نامساعد حالات میں عوام کو اس طرح قائل کرنے میں کامیاب نہ ہوتے کہ کوئی سختی انہیں تعلیمات آئمہ سے ہٹا نہ سکتی۔ معاذ اللہ اگر ان کی شخصیت میں کوئی خامی ہوتی تو دشمن اسے اچھال کر رسوا کر سکتا تھا۔ اور اسے ان کی شخصیت مسخ کرنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن حکمران طبقہ تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے علم و فضل میں کوئی کمی اور ان کی شخصیت میں کوئی ضعف تلاش نہ کر سکا۔ اس مقصد کے لئے حکمران طبقہ مختلف مکاتیب فکر جن میں یہود و نصاریٰ بھی شامل تھے کے بڑے بڑے جید علماء سے ان کے مناظروں کا اہتمام کرتا مگر ہمیشہ ہر مد مقابل کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان تمام حربوں کے بعد یہ جابر حکمران طبقہ ظلم و تشدد پر اتر آیا۔ آئمہ علیہم السلام کو قید اور شہید کرنا شروع کر دیا۔

کیا آپ اس امکان کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ ایک پانچ سال کا معصوم بچہ تمام علماء و منکرین کے روبرو دعویٰ امامت کرے اور نتیجۃً لوگوں کی ایک غیر معمولی تعداد اس پر ایمان بھی لے آئے اور نہ صرف یہ کہ ایمان لے آئے بلکہ ان کی خاطر جانوں کے نذرانے بھی دیئے۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کا یہ تمام عمل اور ان کی محبت بغیر جستجو، تجربے اور فکر کے ہو گی۔ فرض کریں عوام میں ایسا شعور نہ بھی ہو لیکن حکمران طبقہ کیوں ان میں کوئی خامی یا کمزوری تلاش نہ کر سکا۔ اور نتیجے میں ان پر ظلم و ستم کا سلسلہ شروع کر دیا جبکہ حکمران طبقہ کو ان سے کوئی خطرہ بھی نہ ہوتا اگر اس طبقہ کو آئمہ علیہم السلام کی جانب سے کوئی خطرہ در پیش تھا وہ ان کی شخصیت کی کسی خامی یا کمزوری کو اچھال کر انہیں لوگوں میں غیر مقبول بنا کر دور کیا جا سکتا تھا مگر وہ کسی ایسی کمزوری یا نقص کی تلاش میں ناکام رہے اور معصومین کی جان کے در پے ہوئے جس کی وجہ سے اس بچے کی عوامی مقبولیت اور اعتماد میں مزید اضافہ ہوا۔ فرض کریں کہ اس وقت کا حکمران ٹولہ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا لیکن

یہ دعویٰ چند سالوں کا نہیں بلکہ کئی آئمہ نے اس دعویٰ کا اعادہ کیا اور اگر یہ حقیقت پر مبنی ہے تھا اور کسی منصوبہ کے تحت ہوتا تو بعد میں آنے والی نسلوں میں اس کا پول کھل جاتا لیکن آئمہ کے کسی بھی قول و فعل کی تردید نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے تمام مکاتیب فکر کے لوگ تسلیم کرتے تھے۔

یہ تمام واقعات دلالت کرتے ہیں کہ کمسنی میں اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہونا حقیقت ہے اور ہمارے آئمہ علیہم السلام کے سلسلے میں واقعی ایسا ہوا ہے یہ ہرگز کوئی مفروضہ نہیں اس کا ثبوت انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی و واقعات سے بھی ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو کمسنی میں عہدۂ نبوت پر فائز ہو گئے تھے قرآن مجید کی سورۃ مریم آیت نمبر ۱۲ یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ و اٰتینا الحکم صبیاً۔

چنانچہ اسی ثبوت کے بعد آئمہ علیہ السلام کے لئے کم عمری میں عہدۂ امامت پر فائز ہونا کوئی نئی بات نہ تھی چنانچہ یہ اعتراض خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ قائد منتظر اس کمسنی میں کس طرح اس قدر بڑے منصب کے قابل ہوئے۔

کیسے ایمان لے آتیں
مہدی موجود ہے

اب چوتھے سوال کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ قائدؑ کی اتنی طویل عمر اور بچپنے میں امامت پر فائز ہونے کی اہلیت رکھنے کو اگر مان بھی لیا جائے تو یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ مہدیؑ اس وقت بھی موجود ہیں۔

لیکن یہ امکان کیسے ہے کہ وہ موجود بھی ہے پس ہم کس طرح اس کی موجودگی پر ایمان لا سکتے ہیں۔ کتابوں میں مذکور فقط چند روایات و احادیث کس طرح سے اس اہم اور معروف مسئلہ کے لئے دلیل ہو سکتی ہیں؟ ہمارے لئے کس طرح ممکن ہے کہ ہم تاریخی اعتبار سے مہدیؑ کی موجودگی کو ثابت کر سکتے ہیں اور اس حوالے سے اس تاریخی حقیقت کو ثابت کریں کہ یہ کوئی فرضی نظریہ ہرگز نہیں یہی سوالات ہیں جو اس قائد منتظر کے وجود کے لئے ہر باشعور ذہن میں ابھرتے ہیں۔

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ احادیث نبویؐ میں عموماً اور اقوال و روایات آئمہ اہل بیت میں خصوصاً نظریہ مہدیت کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا قائد ہے کہ ایک عالم کو بدلنے کے لئے جس کا انتظار ہے اور اس ضمن میں اتنی کثیر تعداد میں

روایات موجود ہیں کہ کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہمارے اہل سنت بھائیوں کے مطابق اس مسئلہ سے متعلق مختلف واسطوں سے وارد ہونے والی احادیث چار سو کے لگ بھگ ہیں[1] اور سنی و شیعہ دونوں ذرائع سے وارد ہونے والی روایات کی تعداد چھ ہزار[2] سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ اہل اسلام کے مسائل کے ضمن میں اس قدر بڑی تعداد میں روایات کی کوئی دوسری نظیر نہیں۔

نظریہ مہدیت کی علمی تفسیر یہی بارہویں امام ہیں اور یہ تمام تر روایات و احادیث اسی قائم کے بارے میں ہیں اس بیان کے ثبوت بھی ہمارے پاس ڈھیروں دلائل ہیں۔ جن کا خلاصہ ہم مندرجہ ذیل دو دلیلوں میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اسلامی دلیل سے قائم منتظر کے وجود کا اثبات

۲۔ علمی اور منطقی دلیل سے اس نظریہ کی حقانیت کا اثبات اور تاریخی تجربہ کی روشنی میں قائم منتظر کے وجود کے ثبوت۔

بہر حال اسلامی دلیل نبی کریمؐ اور آئمہ اہل بیتؑ کی اس سلسلہ میں وارد ہونے والی سینکڑوں روایات پر مشتمل ہے اور یہ روایات مہدیؑ کو ایک شخصیت میں متشکل کرتی ہیں جو اولاد فاطمہؑ یعنی ذریت حسینؑ میں سے ہوں ہے اور تحقیق خلفاء بارہ میں پس تحقیق یہ روایات اس عمومی نظریہ کو معین اور محدود کرتی ہیں کہ وہ اہل بیتؑ میں سے بارہویں امام ہیں۔ باوجود آئمہ طاہرین کے محتاط رویے کے جو آپ دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے عامۃ الناس میں اختیار کرتے تھے۔ آپ کے ضمن میں روایات کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور فقط ان روایات کی کثرت ہی ان کی قبولیت کا سبب نہیں بلکہ اس کثرت

(۱) ملاحظہ ہو کتاب المہدی

(۲) منتخب الاثر فی الامام الثانی عشر

کے ساتھ ساتھ ایسے قرائن و آثار بھی موجود ہیں جو ان کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ حضورؐ کے بعد بارہ آئمہ، خلفاء یا امراء کے ہونے کے سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث جو مختلف سنی اور شیعہ کی مشہور کتابوں میں موجود ہیں ان کی تعداد ۲۷۰ بنتی ہے۔ ان مشہور کتابوں میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، مسند احمد، مستدرک الحاکم شامل ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بخاری، امام جوادؑ، امام ہادیؑ اور امام عسکریؑ کا ہم عصر ہے۔ جبکہ ابھی بارہ کی تعداد مکمل نہیں ہوئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث نبی کریمؐ سے اس زمانہ سے نقل ہوتی چلی آئی ہے جبکہ ابھی آئمہ کی تعداد مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث امامیہ مکتبۂ فکر سے متاثر ہو کر نہیں نقل کی گئی اور نہ ہی اس مخصوص نظریہ کا عکس العمل ہے کیونکہ جو غلط احادیث نبی کریمؐ سے منسوب کی جاتی ہیں یہ عموماً حضورؐ کے بعد کے زمانے کی ہیں اور ان میں نقل شدہ واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ان روایات کے ذریعے انہیں حضورؐ سے منسوب کر دیا جاتا ہے جن کتابوں میں ایسی احادیث نقل ہوئی ہیں وہ اس واقعہ کے ہونے کے بعد وجود میں آئیں۔ پس یہ ایک واضح دلیل ہے کہ یہ روایات خود ساختہ نہیں اور نہ ہی ان کے راوی فرقہ امامیہ سے متعلق ہیں۔ جنہوں نے اپنے نظریہ کو سچ ثابت کرنے کے لئے ایسی روایات بنائی ہوں بلکہ ان روایات کی نقل تاریخی حوالوں سے اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ نظریہ امامیہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا سرچشمہ خود رسول کریمؐ کی ذات والا صفات ہے۔

علمی اور منطقی دلیل اس تجربہ سے تشکیل پاتی ہے جس سے غیبت صغریٰ کے ستر سالہ دور میں لوگ گزرے اس کی وضاحت کے لئے ہم مختصراً غیبت صغریٰ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

غیبت صغریٰ اس قائد منتظر کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ مشیت ایزدی یہ تھی کہ یہ قائد امامت کا عہدہ سنبھالتے ہی عمومی میدان سے غیبت اختیار کرے اور اپنے وجود کے حوالے سے تمام رونما ہونے والے واقعات سے دور رہے اگرچہ ذہن و دل کے وسیلے سے وہ ان سے نزدیک رہے یقیناً اس غیبت میں یہ لحاظ رکھا گیا تھا کہ یہ اچانک لوگوں پر نہ رونما ہو۔ کیونکہ لوگ ہر زمانے میں زندہ امام کے ساتھ براہ راست تعلق و اتصال اور مسائل کے لئے رجوع کرنے کے عادی ہو چکے تھے پس اگر یہ امام ناگاہ اپنے شیعوں سے غائب ہو جاتا تو انہیں یہ گمان گزرتا کہ فکری و روحانی قیادت ان سے ناطہ توڑ چکی ہے اور یہ اچانک غیبت ان میں خوفناک اور ناگہانی مصیبت کا سبب بنتی جو پورے معاشرے کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیتی ہے اور فیت افتراق میں بدل جاتی پس اس غیبت کی تمہید کے طور پر ایک مختصر غیبت ضروری تھی تاکہ لوگ غیبت کے عمل سے مانوس ہو جائیں اور آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو جائیں اور یہی تمہید غیبت صغریٰ تھی جس میں امام نے عمومی میدان سے تو غیبت اختیار کی مگر اپنے خواص کے ذریعے تمام شیعوں سے دائمی اتصال برقرار رکھا۔ آپ کے یہ مخصوص بااعتماد اصحاب آپؑ اور مومنین کے درمیان رابطے اور واسطے کا کام دیتے رہے۔ اس عرصہ میں چار متقی، پارسا اور نیک افراد نے حکم امام کے تحت آپ کی نیابت کا فریضہ انجام دیا ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں۔

۱۔ عثمان بن سعید العمری
۲۔ محمد بن عثمان بن سعید العمری
۳۔ ابوالقاسم الحسین بن روح
۴۔ ابوالحسن علی بن محمد السمری

انہی چار افراد نے مذکورہ ترتیب کے مطابق بحکم امام یکے بعد دیگرے دور اتد غیبت صغریٰ اہم فرائض انجام دیئے۔ یہ نائبین شیعوں سے ان کے سوالات وصول کرتے اور انہیں بارگاہ امامت میں پیش کرتے امام سے کبھی تحریری اور کبھی زبانی جوابات لے کر شیعوں تک پہنچاتے اور دیدار امام سے محروم لوگوں کے لئے یہی بالواسطہ اطمینان کا سبب بنتے اور یہ سلسلہ تمام عرصۂ غیبت میں جاری رہا جس کی مدت ستر سال ہے جن میں یہ چار نائبین گزرے اور آخری نائب السمری نے غیبت صغریٰ کے اختتام کا اعلان کیا اور بتایا کہ اب غیبت کبریٰ شروع ہوگی جس میں کوئی معین و مخصوص نائب امامؑ نہیں ہوگا۔ غیبت صغریٰ سے غیبت کبریٰ کی طرف یہ تحول و تبدل غیبت صغریٰ کے مقاصد حاصل ہونے کے بعد عمل میں لایا گیا۔ کیونکہ اس طرح شیعوں کو ناگاہ صدمے سے بچا لیا گیا اور بتدریج انہیں عمومی نیابت سے رجوع کرنے کے لئے تیار کر لیا گیا اور اسی طرح امامؑ کی مخصوص نیابت کا نظریہ عمومی نیابت کے نظریے میں بدل گیا یعنی عادل و بصیر جو دینوی و دنیاوی معاملات میں بصیرت رکھنے والا مجتہد اب نیابت امام کا حامل ہو گیا اور یہی غیبت صغریٰ کو غیبت کبریٰ میں بدلنے کا نتیجہ رہا۔

اس روشنی میں آپ کے لئے ممکن ہے کہ وضاحت کے ساتھ اس بات کا ادراک کر سکیں کہ وجود مہدیؑ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے ساتھ افراد کے ایک گروہ نے ستر سال بسر کئے اور اس عرصہ میں سفراء اور مخصوص نائبین کے ذریعہ سے اس امامؑ کا لوگوں سے تعلق و رابطہ قائم رہا اور اس ستر سال کی مدت میں ان نائبین کے بیانات و کلام پر کسی نے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ان کی بات کو جھوٹ پر محمول کیا گیا۔ آپ کو پروردگار کی قسم کوئی ایسی مثال لایئے کہ پورے ستر برس چار معین اشخاص ایک فرضی بات کو دہراتے رہیں یا ایسی شخصیت کی نیابت کے دعویدار ہوں۔

وجود ایک مفروضہ ہو اور کسی نے ان پر اشکال کرنے کی جرأت نہ کی ہو۔ سب کا ایک ہی بات پر اتفاق رہا ہو اور اس نظریہ کی بنیاد پر لوگوں میں آمد و رفت اور تعلق رہا ہو۔ وہ لوگوں میں رہتے رہے اور امامؑ کا خود دیدار کرتے رہے اور ان کے احکامات لوگوں تک پہنچاتے رہے ہوں، ان سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو ان کے موقف میں سقم کا موجب بنے اور نہ ہی ان کے درمیان ایسا کوئی سابقہ رابطہ اور تعلق رہا ہو کہ جس سے یہ احتمال ہو کہ انہوں نے مل بیٹھ کر باہمی منصوبے سے اس نظریہ کو خود وضع کیا ہو اور پھر اس دعویٰ پر وہ تمام لوگوں کا اعتماد بھی حاصل کرلیں اور لوگ انکی روایت کردہ باتوں پر ایمان بھی لے آئیں۔ ایک مشہور مثل ہے کہ جھوٹ کی عمر کم ہوتی ہے اور زندگی کی منطق بھی اس بات کو محال تصور کرتی ہے کہ ایک مفروضہ اتنی کم ہوتی ہے اور زندگی کی منطق بھی اس بات کو محال تصور کرتی ہے کہ ایک مفروضہ اتنی مدت تک لوگوں میں باقی رہے اور لوگ اس کے جھوٹ کا اندازہ نہ کر سکیں عوام اور امام کے درمیان روابط و تعلقات کے ساتھ ساتھ اس نظریہ کا اعتماد بھی بحال رہے۔

اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غیبت صغریٰ کا زمانہ ایک علمی و منطقی تجربہ تھا اور ایک تمہید تھی امام منتظرؑ کی ولادت ، حیات ، غیبت اور اس کی جانب سے غیبت کبریٰ کے اعلان کو تسلیم کروانے کے لئے وہ غیبت کبریٰ جس میں آپ نے لوگوں میں ظاہر نہیں ہوتا تھا اور ایک معینہ مدت تک پردہ غیبت میں رہنا تھا۔

قائمؑ ظاہر کیوں نہیں ہوتا

پھر اس قدر طویل مدت کے بعد قائد کا ظہور کیوں نہیں ہوا؟ اگر اس نے خود کو اجتماعی کام کے لئے تیار کیا ہے تو پھر وہ غیبتِ صغریٰ کے بعد ایک طویل غیبت اختیار کرنے کے بجائے ظاہر کیوں نہیں ہوا کیونکہ اس وقت معاشرتی تبدیلیاں سہل و آسان تھیں اور غیبت صغریٰ کے دوران وہ اپنے روابط و تعلقات سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کو متحد و مجتمع کرنے کے بعد ابتدا ہی سے مضبوط بنیادوں پر اپنا کام شروع کر سکتا تھا۔ اس وقت اس کے گرد و نواح کی حکومتیں اس قدر قوی اور طاقت ور نہ تھیں جتنی صنعتی و سائنسی انقلاب کے بعد اس دور میں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر نوع کی اجتماعی و معاشرتی تبدیلی کی کامیابی بعض شرائط اور حالات سے مربوط ہوتی ہے جن کی عدم موجودگی میں مطلوبہ تبدیلی لانے میں کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔

ربِ سما کی طرف سے زمین پر جو اجتماعی تغیرات و تبدل لائے جاتے ہیں وہ اس اعتبار سے امتیازی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نوعیت میں خارجی ماحول کے ساتھ مربوط اور متعلق نہیں ہوتے کیونکہ اس مقام پر جو قانونِ تغیر و تبدل کا سہارا لیتا ہے وہ ربِ سما کی طرف سے وضع کردہ ہوتا ہے۔ خارجی ماحول و حالات کی پیداوار نہیں ہوتا لیکن یہ تغیرات بھی نفاذ کے مرحلہ میں خارجی حالات پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کی کامیابی اور نفاذ کا وقت ان حالات سے مربوط ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی خدا نے زمانۂ جاہلیت کی پانچ صدیاں انتظار کرنے کے بعد اپنا آخری پیغام ختم مرسلینؐ کے ذریعے بھجوایا۔ کیونکہ اس پیغام کا نفاذ مخصوص حالات پر موقوف تھا لہٰذا ان حالات کی پیدائش کا انتظار کیا گیا ورنہ دنیا کو اس سے بہت پہلے اس کی ضرورت تھی۔

وہ خارجی حالات جو مخصوص معاشرتی تبدیلی کے عمل کے لئے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک لازمی عنصر فضا اور ماحول کی اس تبدیلی کے لئے آمادگی ہے اور اس تبدیلی کے مقاصد کے موافق حالات کی موجودگی ہے۔ بالیسی تفاصیل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو عمل تغیر کی مختلف منازل پر جن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً روس میں لینن کی کامیابی ایک طرف پہلی جنگ عظیم چھڑنے کے ساتھ مربوط تھی اور دوسری طرف بادشاہت کا ظلم و ستم اور لوگوں کی اس سے نفرت کے ساتھ اور یہی وہ حالات ہیں جو کسی قسم کی تبدیلی لانے کے لئے ماحول کو سازگار بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تحریک بعض جزئیاتی اسباب سے مربوط تھی جو انتہائی محدود تھے مثلاً روس کے دورہ میں لینن کی سلامتی اور اس کا انقلاب کی قیادت کرنا کیونکہ اگر اس دوران اسے کوئی حادثہ پیش آجاتا، تو یہ انقلاب اس قدر جلد رونما نہ ہوتا۔

اور تحقیق اللہ تعالیٰ کا طریقۂ کار اور سنت بھی یہی ہے جس میں کسی نوعیت

تغیر و تبدل ممکن نہیں کہ ایسی تبدیلیوں کو نافذ کرنے کا عمل مناسب ماحول اور حالات کا تقاضا ہے جن میں اس تبدیلی کو عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ یہ تبدیلی کا عمل پوری طرح کامیابی سے ہمکنار ہو سکے یہی وجہ ہے دینِ اسلام چند رسولوں کے نزول کے بعد آیا اور اس درمیان ایک طویل اور بڑا تلخ خلا موجود ہے۔ جس کی طوالت صدیوں پر محیط رہی یعنی حضرت عیسیٰؑ اور نبی آخر الزماںؐ کے نزول کا درمیانی عرصہ۔ یہ تمام تر انتظار مناسب ماحول اور سازگار حالات کے لئے ہی تھا۔

باوجودیکہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ ان تمام مشکلات کو آسان کر دے رکاوٹیں ہٹا دے، ماحول اور حالات کو عمل تغیر کے لئے سازگار بنا لے اور یہ سب کچھ معجزے سے کر دے لیکن ارادۂ خداوندی اور مشیتِ ایزدی نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ امتحان، آزمائش اور تکالیف جو انسان کو کامل بناتی ہیں۔ ان کا تقاضا ہوتا ہے کہ عمل تغیر خارجی و طبعی عوامل کے مطابق ہو لیکن وہ مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں جب تغیر ربانی کے لئے ماحول سازگار نہیں ہوتا اور قدرتِ الٰہی خود متوجہ ہو کر معجزہ کے ذریعے ایک تبدیلی رونما کر دیتی ہے انہی مخصوص مواقع سے وہ امدادات و تائیدات بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے بندگانِ خاص کو سخت حالات میں ان کی جان کے تحفظ کے لئے حاصل ہوتی ہیں۔ نمرود کی آگ کا حضرت ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈا ہو جانا، نبی آخر الزماںؐ پر حملہ آور یہودی کا ہاتھ شل ہونا۔ جنگ احزاب میں تند و تیز آندھی و طوفان کا آنا اور مدینے کا محاصرہ کرنے والے کفار کے قیام کا اکھڑ جانا اسی کی مثالیں ہیں لیکن اگر عمومی حالات تغیر ربانی کے لئے سازگار ہو چکے ہوں تو اس قسم کی عنایات ربانی تفاصیل کے ضمن میں آتی ہیں

اب اسی روشنی میں ہم امام مہدیؑ کے موقف اور مرکزیت کا مطالعہ کرتے

ہیں۔ جو تبدیلی کا عمل ان کے ذمہ ہے وہ بھی دیگر اعمال کی طرح مخصوص حالات کا متقاضی ہے جو اس کے مقاصد کے ساتھ مرتبط ہوں۔ اور اسی وجہ سے یہ طبعی امر ہے کہ ان مخصوص حالات کی پیدائش تک ان کا انتظار کیا جائے ہمیں یہ بھی علم ہے کہ مہدی سے مخصوص انقلاب کسی خاص طبقہ، علاقہ یا گروہ تک محدود نہیں بلکہ آپ کا پیغام اور اس کا نفاذ ایک عالمگیر اور آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ تمام کائنات کے لئے امن وسلامتی اور خوشحالی کے پیغامبر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس پیغام کے لئے آپ کو مخصوص ونامزد کیا ہے۔ اس کا مقصد پوری عالمی معاشرت میں تبدیلی لانا ظلم واستحصال کا خاتمہ اسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنا اور عدل وانصاف، مساوات و امن اور علم کی روشنی میں اجتماعی سکھ وسلامتی کے لئے معاشرے کا قیام عمل میں لانا ہے۔ یہ ایک بہت وسیع وجامع تبدیلی کا عمل ہے اور اس کے لئے شرط صرف پیغام کا نازل ہو جانا اور قائد کا صالح ہونا نہیں۔ ورنہ یہ شرائط تو رسالت مآبؐ میں موجود تھیں پیغام آپ کا تھا اور معاشرہ اپنی کامل وکلی قابلیت کے ساتھ دنیا میں موجود تھا لیکن درحقیقت اس قدر بڑی عالمی تبدیلی ایک خاص ماحول اور حالات کی متقاضی ہے جس کو خارجی واقعات ترتیب دیں گے۔

بشری اعتبار سے انسانی معاشرہ کا یہ احساس اس عمل تبدل کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ فضا عدل وانصاف کے پیغام نو کے لئے ہموار ہے اور یہ احساس انسانی معاشرہ پر امن وسلامتی کے حصول کے لئے متعدد قوانین کے نفاذ کے عملی تجربے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جب انسان یہ دیکھے گا کہ اس کی گمشدہ حکمت ان قوانین سے حاصل نہیں ہو رہی۔ بدامنی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، غارتگری عام ہوتی جارہی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک غیبی طاقت کی طرف سے متوجہ ہوگا۔ یا ایک مجہول ذات کی آمد کا

منتظر ہوگا۔ اور ذہنی وفکری طور پر نئی تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جدید مادی زندگی مادی اعتبار سے پوری دنیا میں اس پیغام کو پہنچانے میں مساعد ومددگار ہے۔ کیونکہ قدیم زمانے اور خصوصاً غیبت صغریٰ کے زمانے کی نسبت انسان مادی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ فاصلے سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ اقوام عالم میں رابطہ آسان سے آسان تر ہوتا جارہا ہے اور عالمی بیداری اور افکار انسان کو عدل ومساوات کے نفاذ کرنے کے لئے تیار کرنے کے لئے بہت عمدہ اور موثر وسائل مہیا ہیں اور ان کے استعمال سے اس عالمگیر تبدیلی کے لئے ممد ومعاون حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

اور مہدی موعودؑ کے ظہور میں دیر سے حربی قوت وسازو سامان میں جدید تبدیلیوں کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے یہ درست بات ہے کہ لیکن اس مادی قوت میں روز افزوں اضافے سے کیا فائدہ جبکہ انسانی روح کمزوری، ناکامی اور محرومی کا شکار ہو، تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ ایک بہت بڑی تہذیب اپنی تمام تر قوت کے باوجود جنگ کے ابتدائی مرحلے ہی میں شکست سے دوچار ہوگئی کیونکہ وہ اندرونی طور پر کھوکھلا ہو چکی تھی۔ اعتماد کھو بیٹھی تھی اور اپنے وسائل پر عدم قناعت اور خارجی حالات سے عدم اطمینان کی لپیٹ میں آچکی تھی یعنی بہر حال یہ مادی قوت روحانی قوت کے بغیر بیہودہ و بیکار ہے (افغانستان میں روس اور ایران کے ہاتھوں امریکہ کی عملی شکست ہے)

اس قدر وسیع و عالمگیر کام اور
تنہا مہدیؑ

اور اب گفتگو ہوگی سوالات کے اس سلسلہ کے چھٹے سوال پر کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس قدر بڑا کام اور ایک ہی فرد (خواہ وہ کس قدر شان اہلیت کا حامل کیوں نہ ہو) کے ذمے ہو؟ کیا یہ فرد واحد وہی انسان نہیں جسے حالات واسباب اس تبدیلی کی تحریک کے لئے منتخب کریں گے؟

یہ سوال تاریخ سے متعلق ایک مخصوص نظریے کی پیداوار ہے جس کے مطابق کسی ماحول یا حالات میں تبدیلی کے عمل میں انسان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے تبدیلی کا اصل محرک اور موجب حالات و ماحول ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں کہ اس انسان کا خود بھی کوئی اساسی کردار ہو۔

اور ہم اپنی دیگر کتب میں مختلف مقامات پر واضح کر چکے ہیں کہ تاریخ کے دو محور ہوتے ہیں۔

۱۔ انسان

۲۔ وہ مادی وسائل جو انسان کو میسر ہیں یا اس سے متعلق مادی حالات۔

جس طرح مادی وسائل فطرتِ انسان میں اپنا اثر رکھتی ہیں اسی طرح خود انسان بھی حالات پر اثر انداز ہوتا ہے اس مفروضہ کا کوئی جواز نہیں کہ کوئی اہم عمل مادے سے شروع ہو کر انسان پر اختتام پذیر ہو، کیونکہ اس مفروضے کے حق میں جس قدر جواز ہے اسی قدر جواز انہیں زائل کرنے کو بھی ہیں پس انسان اور مادہ وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے متاثر ہوئے ہیں اور نظریاتی اعتبار سے انسانی کا کردار تاریخ سازی میں کسی سدھائے ہوئے طوطے کی مانند نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اور واضح اثر مرتب کرنے والا ہے۔

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تاریخ نبوت سے ثابت ہوتی ہے اور خصوصاً تاریخ نبوت کے آخری باب میں زیادہ اجاگر اور روشن نظر آتی ہے کیونکہ محمدؐ کا ربط و تعلق قوت سماوی سے تھا۔ اس لئے آپ نے عنانِ تاریخ اپنے ہاتھ میں لے لی اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی جو اس دور کے حالات کی بنا پر اِک ناممکن بات تھی لیکن آپؐ اس مقصد میں کامیاب ہوئے جیسا کہ ہم اس بات کی وضاحت الفتاوی الواضحہ کے مقدمہ نمبر ۲ میں ہے۔

اور جو امر رسول کریمؐ کے حد امکان میں تھا وہ اس قائد منتظر کے امکان میں بھی ہے اور وہ فرد واحد ہونے کے باوجود اس بڑی تبدیلی کو لا سکتا ہے اور ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈال سکتا ہے۔ حالات و ماحول اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے کیونکہ یہ انسان حالات کی پیداوار نہیں ہو گا۔

یوم موعود اور
عمل تغیّر کا طریقہ کار

اب رہا آخری سوال جس میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا کہ قائدٔ منتظر کون سے راستے کو اختیار کر کے اس قدر بڑی تبدیلی لانے میں کامیاب ہوں گے۔

اس سوال کے جواب کا تعلق ظہور امامؑ کے زمانے کے حالات سے ہے اور ان حالات و ماحول کے مشاہدے کے بعد ہی بتایا جا سکتا ہے کہ مہدیؑ کس طور سے تبدیلی کے عمل کو شروع کریں گے۔ لہٰذا جب تک ہم اس وقت سے لاعلم ہیں اور اس کے حالات کے متعلق خبر نہیں رکھتے۔ یوم موعود میں ہونے والے عمل کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کر سکتے۔ اگرچہ انسانی ذہن میں جنم لینے والے مفروضات و خیالات پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سلسلے میں یوم موعود کے بارے میں احادیث اور بڑی بڑی تاریخی تبدیلیوں کے موثر محرکات کی روشنی میں ایک بنیادی مفروضہ قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

اس مفروضے کے مطابق مہدیؑ ایک بہت بڑے خلا کے بعد میدان عمل میں آتا ہے۔ اس خلا میں ذلت و تباہی کی سیاست اور گھٹیا قسم کی تہذیبیں جنم لیتی

گی اور یہ خلا ایک نئے پیغام کے داعی ہونے کے اسباب مہیا کرے گا۔ یہ ذلیل و رسوا طرزِ سیاست نفسیاتی طور پر ایک ایسا ماحول پیدا کر دے گی۔ جو اس نئے پیغام کی قبولیت کا سبب ہوگا۔ اور یہ ذلت و رسوائی تاریخِ انسانیت میں اچانک رونما ہونے والا حادثہ نہیں بلکہ یہ انسانیت کا خداوند تعالیٰ سے تعلق منقطع ہونے کے سبب پیدا ہونے والے تنازعات و تضادات کا نتیجہ ہے اور اس کے خاتمے کے لئے کوئی دوسرا حل نہیں پس جنگ کی آگ بڑھے گی جو ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے کر فنا کر دے گی پس اس مقام پر نورِ الٰہی کا ظہور ہوگا۔ اور اس آگ کو ٹھنڈا کر دے گا اور زمین پر عدل آسمانی قائم کرے گا۔

اختتامیہ

میں اس مختصر کتابچہ کو بصد مسرت ختم کر رہا ہوں اور خدائے لم یزل سے دعا گو ہوں کہ اسے میری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب فرمائے اور اسے اپنی راہ پر چلنے والے کے لئے ایسے روشن مینار کی مانند بنائے۔ کہ جو اہلِ اسلام کے رہنماؤں کا فریضہ انجام دے سکے۔

تمام تر تعاریف اور حمد و ثنا کا مرکز رب العالمین ہے
اور درود و سلام ہو محمدؐ و آلِ محمدؐ پر

واللہ ولی التوفیق وقت آغاز ۔ ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ
اختتام ۔ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ

محمد باقر الصدر النجف الاشرف

اختتام ترجمہ و نظر ثانی ۹ شعبان ۱۴۰۱ھ
بروز جمعۃ المبارک

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230